طارق محمود ہاشمی*

اردو شاعری میں تحسینِ منٹو

شاعری میں کسی شخصیت کا موضوع بنا کوئی ایسا انفرادیت کا پہلو نہیں۔ شعرا جن آدرشوں سے اپنی فکر کا دھارا جوڑتے ہیں، ان سے وابستہ افراد کی تحسین کے لیے بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی شخصیات بھی موضوعِ سخن بنتی رہی ہیں، جن سے شعرا کسی بھی سبب سے ایک قلبی وابستگی رکھتے ہیں لیکن منٹو کے سلسلے میں یہ امر ضرور قابلِ غور ہے کہ وہ واحد افسانہ نگار ہے جو ایک وسیع سطح پر اردو شعرا کے لیے توجہ کا مرکز بنا ہے اور شاعروں نے جہاں اس کی سحر انگیز شخصیت کے پُرکشش خاکے منظوم کیے ہیں، وہاں منٹو کے فن کی تحسین کے تناظر میں ان معاشرتی کجیوں پر اپنا غصہ رقم کیا ہے، جنھیں منٹو نے اپنے افسانوں میں کہانی کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

منٹو پر پہلی قابلِ ذکر نظم مجید امجد کی ہے جو خود فرمائش کر کے لکھوائی گئی۔ ۱۹۵۲ء میں رقم کی گئی یہ نظم اس مجموعے کا حصہ بنا تھی جو معاصر اہلِ قلم کے منٹو پر مضامین و تاثرات پر مشتمل ناخن کا قرض کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ یہ بات منٹو کے علم میں تھی کہ ممتاز شیریں ان پر ایک کتاب لکھ رہی ہیں تاہم انھیں یہ تمنا ضرور تھی کہ ان پر لکھی جانے والی نگارشات کا ایک مجموعہ بھی سامنے آنا چاہیے۔ نقوش کا منٹو نمبر بھی اگرچہ منٹو کی وفات کے بعد مرتب ہوا لیکن محمد طفیل نے اس نمبر کا ابتدائیہ منٹو کے ساتھ ایک مکالمے کی شکل میں لکھا ہے جس میں منٹو اس امر پر اصرار کر رہے ہیں کہ نقوش کا

منٹو نمبر منظرِ عام پر آنا چاہیے۔ ابتدایئے کے اختتام پر محمد طفیل نے لکھا:

> اگر چہ یہ واقعہ (یعنی مذکورہ مکالمہ) ایک برس پہلے کا قصہ ہے لیکن میں آج بھی یہ نمبر منٹو کی زندگی ہی میں شائع کر رہا ہوں اس لیے کہ منٹو کسی اور کے خیال میں مرا ہو تو مرا ہو میرے نزدیک نہیں مرا۔[۱]

منٹو کی محمد طفیل سے کی گئی فرمائش نقوش کے منٹو نمبر کے ابتدایئے سے ملتی ہے جب کہ مجید امجد سے نظم کی فرمائش کا پتہ اس خط سے چلتا ہے جو قند کے مجید امجد نمبر میں شائع ہوا۔ منٹو لکھتے ہیں:

> فوراً قلم اٹھایئے اور نظم یا نثر میرے بارے میں جو impression آپ کے دماغ میں آئیں کاغذ پر منتقل کر دیجیے۔ یہ فوری طور پر ہونا چاہیے ...... میں واپسی ڈاک میں آپ کے impression کا منتظر رہوں گا۔[۲]

آزاد نظم کی ہیئت میں لکھی گئی مجید امجد کی نظم ''منٹو'' کے عنوان سے ہے جس میں ان کی ظاہری شخصیت کے خدوخال سے لے کر فکری مزاج کی گمبھیرتا تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ نظم مجید امجد کے فن میں ہیئتی نیرنگیوں کے جمال کا تسلسل بھی ہے جس میں شاعر نے مصرعوں کی ایک خاص ترتیب کو پہلے برقرار رکھ کر اور آخر میں اسے توڑ کر ایک خاص حسن پیدا کیا ہے۔ نیز قوافی کے نظام سے مثنوی اور آزاد نظم کے امتزاج کی بھی صورت نکالی گئی ہے۔

نظم میں منٹو کی شخصیت کو اس طور سے اجاگر کیا گیا ہے کہ اس کے افسانوں کی بنیادی روح ایک پیکر میں ڈھلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ جس طرح سماج میں موجود انسانی تضادات یا ثنویت کو اجاگر کرتا تھا شاعر نے یہ کوشش کی ہے کہ منٹو کا خاکہ تشکیل دیتے ہوئے اِس پہلو کو واضح انداز میں ابھارا جائے۔

میں نے اس کو دیکھا ہے
اُجلی اُجلی سڑکوں پر اک گرد بھری حیرانی میں
پھیلتی بھیڑ کے اوندھے اوندھے کٹوروں کی طغیانی میں

جب وہ خالی بوتل پھینک کے کہتا ہے:

"دنیا! تیرا حسن، یہی بدصورتی ہے!"
دنیا اس کو گھورتی ہے
شور سلاسل بن کر گونجنے لگتا ہے
انگاروں بھری آنکھوں میں یہ تند سوال
کون ہے یہ جس نے اپنی بھکی بھکی سانسوں کا جال
بامِ زماں پر پھینکا ہے؟
کون ہے جو بل کھاتے ضمیروں کے پُر پیچ دھندلکوں میں
روحوں کے عفریت کدوں کے زہر اندوز محلکوں میں
لے آیا ہے، یوں بن پوچھے، اپنے آپ،
عینک کے برفیلے شیشوں سے چھنتی نظروں کی چاپ؟
کون ہے یہ گستاخ؟
تاخ، تڑاخ![۳]

نظم میں تین کردار ہیں، واحد متکلم (شاعر)،منٹو اور دنیا۔ واحد متکلم کے منٹو کے بارے میں بیان میں سماجی تضادات بہت واضح ہیں۔شہر کی سڑکیں اجلی ہیں مگر منٹو حیرت کی گرد میں اٹا ہوا ہے۔ چھلکتی بھیڑ کے کٹوروں میں ایک طغیانی ہے لیکن منٹو کی بوتل خالی ہے۔ یہاں شاعر نے منٹو کا جو مکالمہ درج کیا ہے اس میں بھی اسی تضاد کو ڈرامائی کیا گیا ہے۔"دنیا تیرا حسن، یہی بدصورتی ہے"۔ یہ مصرعہ بیانِ سادہ کے طور پر اور جب کہ استفہامیہ صورت میں ایک الگ مفہوم رکھتا ہے۔ یہاں نظم کا تیسرا کردار ایک عجیب سی جھنجلاہٹ کے ساتھ ظاہر ہو کر منٹو پر اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے یہ کردار منٹو کے مذکورہ بیان پر اپنے قہرناک ردِ عمل کا اظہار تین بار "کون ہے؟" کے استفہام سے کرتا ہے جو ظاہر ہے کہ محض منٹو کے بارے میں ایک استفسار نہیں بلکہ غصے سے بھری ہوئی نفرت اور تذلیل کا اظہار ہے اور آخری بار استفہام میں جس نوع کی جھنجلاہٹ ہے۔ وہ بقول سجاد شیخ:

> ایک استفہامی نوعیت کا جملہ نہیں ہے جس میں گستاخی کے مرتکب کی identity یا شناخت کے بارے میں سوال کیا جارہا ہے۔ یہ تو ایک تحکمانہ دھمکی آمیز انداز گفتگو ہے جو دراصل tyrannical رویے کو اجاگر کرنے والا اور غصیلی، جارحانہ، متشدد

تعزیری کاروائی کی روداد کو غزل کی روایتی ایمائیت سے پیش کرنے والا چار لفظی جملہ ہے۔[۴]

شاد امرتسری کی نظم ''سعادت حسن منٹو'' دو اعتبار سے اہم ہے۔ ایک یہ کہ اس کے خالق منٹو کے چہیتے دوست تھے۔ دوسرا یہ کہ منٹو کے انتقال کے فوراً بعد ہونے والے تعزیتی اجلاس منعقدہ ۲۳ جنوری ۱۹۵۵ء کو پڑھی گئی۔ یونس جاوید کی تحقیق کی روشنی میں اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد باقر نے کی، مضامین امجد الطاف اور سید عابد علی عابد نے پڑھے جب کہ سیکرٹری صاحب نے قرارداد پیش کی۔[۵]

سیدھے سبھاؤ میں لکھی گئی یہ نظم اپنے خالق کی اس کے دوست سے عقیدت کا اظہار کرتی ہے اور ۶ بندوں پر مشتمل اس نظم میں منٹو کی شراب نوشی اور اہل دنیا کی منٹو سے گریز پائی پر طنز کرتے ہوئے مستقبل میں اس پر طویل عرصے تک تنقید رقم کیے جانے کی نوید ہے۔ نظم کا اختتام اس حقیقت پر ہوتا ہے:

میں نہ شاعر نہ کوئی اہلِ قلم ہوں اے دوست!
میں ترے فن پہ کوئی بات نہیں کر سکتا
ہاں مگر قول ترا آج بھی ہے یاد مجھے
فن صداقت کا امیں ہو تو نہیں مر سکتا[۶]

منٹو کے انتقال کے فوری بعد اس کی تحسین میں لکھی گئی ایک اور اہم نظم ظفر اقبال کی ہے۔ ۱۱ مصرعوں پر مشتمل یہ مختصر سی نظم اس شاعر نے رقم کی ہے جس کا تمام تر تخلیقی سفر غزل کی آبیاری اور اس صنف کے نئے سے نئے افق تلاش کرنے میں گذرا، مگر یہ مختصر نظم اس کے اندر کائناتِ غزل سے باہر کے بھی امکانات کا پتا دے رہی ہے۔

''سعادت حسن منٹو'' کے عنوان سے لکھے گئے یہ چند مصرعے منٹو سے زیادہ اس ماحول کا مرثیہ ہیں جس کی عکاسی وہ اپنے افسانوں میں کرتا رہا۔ شاعر نے اس ماحول کی تمثال گری اگرچہ قدرے کمزور اسلوب میں کی ہے تاہم طنز کی نشتریت بہت گہری ہے۔

ترے وجود سے آلودہ تھی یہ پاک زمیں
تری نوا سے پراگندہ تھے نشیب و فراز

نہ تجھ کو خوفِ خدا تھا، نہ احترامِ ادب
زمانے بھر پہ عیاں تھا ترے کمال کا راز
حقیقتوں میں بھٹکتا رہا دماغ ترا

سے کے ہاتھ نے چھلکا دیا ایاغ ترا
ہوائے مرگ نے گل کر دیا چراغ ترا

اب ایک بات کہ لرزاں ہے سب زبانوں پر
شکن شکن ہوئی جاتی ہے جس سے سب کی جبیں
کہ نور و نار کی سرحد پہ آسمانوں پر
خدائے عرش ترے ہاتھ چوم لے نہ کہیں[۷]

نظم کا حسنِ ترتیب اور ہیئتی نظام قابلِ توجہ ہے۔ تین حصوں میں تقسیم یہ نظم منٹو کی زندگی، موت اور بعد از موت کے زمانی عرصوں کی عکاسی ہے۔ پہلا حصہ منٹو کی الزامات سے پُر زندگی کا اظہار ہے اور تخلیق کار نے طنز کا ہدف لفظی سطح پر منٹو کو جب کہ معنوی طور پر ماحول کو بنایا ہے۔ نظم کا دوسرا حصہ صرف ایک شعر پر مشتمل ہے اور موت کے لمحے کی رعایت سے اِسے مختصر ہی رکھا گیا ہے۔ آخری حصہ بعد از مرگ معاشرے کے احساسِ ندامت کے ساتھ ساتھ اعترافِ عظمت کا بھی اظہار ہے۔

خدائے عرش ترے ہاتھ چوم لے نہ کہیں

یہ مصرعہ اپنے اندر معنویت کی کئی پرتیں رکھتا ہے۔ خدا کا منٹو کے ہاتھ چومنا خلاقِ ازل کا منٹو سے پیار کا اظہار بھی ہے اور اُس کے فنِ افسانہ نگاری کی عظمت کا اعتراف بھی۔ نیز اس تحریر کی توثیق بھی جو منٹو کے کتبے پر کندہ کی گئی ہے۔ گویا خدا نے منٹو کے ہاتھ چوم کر یہ اعتراف کر لیا منٹو اُس سے بڑا کہانی کار ہے۔

نظم کا ہیئتی نظام بھی دلچسپ ہے۔ ابتدائی بند کے ۵ مصرعے ہیں۔ پہلے یہ مصرعے ایک قطعے کی صورت میں ہیں جب کہ پانچواں مصرعہ اگلے حصے کے دونوں مصرعوں کے ساتھ ہم قافیہ و ہم

ردیف ہے۔آخری حصہ بھی ایک قطعہ ہے جس کے حرف جفت مصرعوں میں ہی ہم قافیے نہیں بلکہ طاق مصرعوں میں بھی یہ التزام ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ایک اور قابلِ توجہ امر یہ بھی ہے کہ نظم کا پہلا اور آخری مصرعہ یکساں قوافی میں ہیں۔

سعادت حسن منٹو کی تحسین میں ظفر اقبال کی ایک غزل بھی قابلِ توجہ ہے جسے ''خراج'' کا عنوان دے کر نظم کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔غزل کے اشعار اپنی صنفی خصوصیت کے باعث وسعتِ معنی بھی رکھتے ہیں اور ایمائی طرزِ اظہار بھی۔'تو'، 'تیرا' اور 'تجھ' ایسے اسمائے ضمیر کے ذریعے مختلف اشعار میں منٹو کی شخصیت کے تخلیقی خاکے کے متنوع رنگ ظاہر کیے گئے ہیں۔غزل کی ردیف چونکہ ایک حرفِ تشبیہ ہے تو منٹو کی شخصی صفات اور تخلیقی سفر کے لیے بعض عمدہ تشبیہات بھی استعمال کی گئی ہیں۔اگر چہ یہ تشبیہات اردو غزل کے سرمائے میں نئی یا نایاب نہیں ہیں۔

غزل کے مقطعے میں شاعر کی دروں بینی بھی حیرت افزا ہے جس میں شاعر نے خود کو منٹو کے ایک کردار کے روپ میں ظاہر کیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کام تھا یوں تو کسی خواب کنارے جیسا
کوئی چمکا نہ تری طرح ستارے جیسا
تیرے باہر میں جھلکتا تھا سکوں اور سکوت
کچھ تڑپتا رہا اندر ترے پارے جیسا
ایک تشویش بھرا تیرا کرشمہ یکسر
دیکھنے میں ہے کسی نرم نظارے جیسا
ہمیں لگتا ہے ظفرؔ بھی کوئی تیرا کردار
تختی و تلخی حالات کے مارے جیسا[۸]

مصطفیٰ زیدی کی نظم ''ایک علامت'' ۱۱ بندوں پر مشتمل قدرے طویل نظم ہے جو زمانے کی روش پر ایک طنزیہ پیرائے میں شروع ہوتی ہے۔حقائق سے انکار کر کے خود ساختہ معیارات کی تشکیل کے رویے کو ایک علامتی پیرائے میں پیش کرتے ہوئے قلم قبیلے کے ان افراد کو ہدفِ طنز بنایا گیا ہے جن کے زاویۂ نظر میں سطحی پن پایا جاتا ہے اور جن کے رویوں میں مہوبت اور دوہرا پن نمایاں ہے۔

مصطفیٰ زیدی کی اس نظم میں فکر کی ترسیل کے لیے بیانیہ انداز اور تمثال کاری ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ شاعر جن رویوں پر طنز کرتا ہے ان کی حقیقی تصویر دکھانے کے لیے تمثال بھی بطور مثال پیش کرتا ہے:

ایک رقاصۂ طناز کی محفل ہے جہاں
کبھی آتے ہیں بھتیجے کبھی عم آتے ہیں[۹]

دنیا اسی رنگ و نور کی بزمِ تاباں بن چکی ہے لیکن وہ تاریکی جو ذہنوں میں گھر چکی ہے اسے مٹانے کے لیے کوئی جگنو بھی کوشش کرے تو فریاد و فغاں ہونے لگتی ہے۔ یہ گریہ زاری دراصل ان بتانِ وہم و گماں کی بقا کے لیے ہے جنھیں اہلِ زمانہ خدا تسلیم کرتے ہیں اور جب بھی کوئی اہلِ دانش توہم کے ان پیکروں کی حقیقت کھولتا ہے تو اہلِ زمانہ اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔

اس نظم میں منٹو کو شاعر نے زمانے کی مذکورہ روش کے تناظر میں ایک پیمبر حقیقت کی مثال قرار دیا ہے کہ جس پہ زمانہ ہنستا ہے مگر ایک وقت آتا ہے جب وقت کو اپنی پیشانی جھکانی ہی پڑتی ہے۔ منٹو وہ قلم کار ہے جو محض ایک دور میں نہیں پیدا ہوا بلکہ ہر دور میں جنم لیتا رہے گا اور سماجی گھٹن، فکری حبس اور جھوٹی اخلاقیات کا پردہ چاک کرتا رہے گا۔

اپنی حساس شبک ناک سے رومال ہٹاؤ
کھاد میں محض تعفّن ہی نہیں، خیز بھی ہے
ذوق درکار ہے قطرے کو گہر کرنے میں
یہ مئے ناب پُراسرار بھی ہے تیز بھی ہے
کچھ تو ہے وجہِ دل آزاری و آہنگ و ستیز
ورنہ یہ طبع خوش اخلاق و کم آمیز بھی ہے

....

شہر کی تیرہ و تاریک گذر گاہوں میں
داستاں ہوگی تو منٹو کا قلم لکھے گا
زیست قانون و فرامینِ قفس کے آگے
بے زباں ہوگی تو منٹو کا قلم لکھے گا

اس شفاخانۂ اخلاق میں نشتر کے قریب
رگِ جاں ہوگی تو منٹو کا قلم لکھے گا[10]

دوسرے بند میں منٹو کا نام محض ایک نام کے طور پر نہیں بلکہ ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ وہ تمام اہلِ قلم جو وقت کی آواز بنتے ہیں، جو حقائق کو ان کی اصل شکل میں دکھاتے ہیں، جن کا مزاج خوش اخلاق و کم آمیز ہوتا ہے لیکن وہ بلند آہنگی اور ستیزہ کاری کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ منٹو محض ایک وجود میں ڈھلا ہوا فن کار نہیں تھا بلکہ فن کے آدرش کی روحِ ابدی کی علامت تھا۔ نظم کے اختتام پر شاعر نے سعادت اور منٹو دونوں کو الگ الگ وجود کے طور پر پیش کرتے ہوئے سعادت کو فنا ہو جانے والا ایک فرد جب کہ منٹو کو ابد تک باقی رہنے والی روح قرار دیا ہے۔

موت یہ صرف سعادت کی ہے منٹو کی نہیں
یہ شب و روز ترے ہیں، یہ صدی تیری ہے[11]

منٹو پر لکھی گئی نظموں میں جہاں منٹو کی شخصیت اور فن کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں وہاں خود ان کے تخلیق کاروں کی اُفتادِ طبع بھی واضح ہوتی ہے۔ مثلاً عبدالحمید عدم کی نظم 'میرے دیرینہ ہم سفر' میں منٹو کے ساتھ بادہ نوشی کی یادوں کا تذکرہ ہے۔ مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی اس نظم کا فنی معیار شاد امرتسری کی نظم سے کچھ زیادہ نہیں۔ بہت سادہ الفاظ میں لکھی گئی اس نظم کے اسلوب میں عدم کی غزلوں کے انداز کی جھلک بھی نمایاں ہے۔

حبیب جالب اور احمد ریاض ترقی پسند سوچ کے علمبردار شاعر رہے ہیں۔ منٹو پر ان شعرا کی منظومات میں بھی اسی فکر اور اسلوب کا عکس نمایاں ہے۔

''منٹو کے انتقال پر'' کے عنوان سے حبیب جالب کی نظم ایک مصرعے سے قطعِ نظر مثنوی کی ہیئت میں ایک طنزیہ نظم ہے جس میں جہالت اور مقتدر طبقے کے بے حس رویوں کی عکاسی کی گئی ہے لیکن نظم کا اختتام سماج کے بجائے اس طنز پر ہوتا ہے جو منٹو پر کیا گیا ہے:

مر گیا ہے جو منٹو تو ہم کیا کریں
اک ذرا بات پر آنکھ نم کیا کریں[12]

شاعر نے جس بے حسی کا اظہار کیا ہے یہ رویہ تخلیق کار کا نہیں بلکہ معاشرے کے افراد کا ہے

جو اس شعر میں اکائی میں ڈھل کر ایک کردار کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں۔

احمد ریاض کی نظم مختصر مگر فکر انگیز ہے۔ نصف سے زائد بند منٹو سے زیادہ اس دنیا اور ماحول کی تمثال ہیں، جن میں منٹو نے سانس لیا۔ اس تمثال میں جو تصویر دکھائی گئی اس میں سرمایہ پرستی اور ہوس پرستی ہر دو تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں؛ جن میں سوال بھی ہے، حیرت بھی، طنز بھی اور تفہیم کی کوشش بھی۔ ان بندوں میں احمد ریاض نے زندگی کے بارے میں جو زاویۂ نظر پیش کیا ہے، وہ ان کی دیگر نظموں خصوصاً ''مجرم''، ''عوامی فنکار''، ''یہ زنجیرِ گراں''، ''یہ لوگ'' اور ''محرومی'' سے بھی واضح ہے لیکن مذکورہ نظموں کی نسبت منٹو پر لکھی گئی نظم ''ایک عظیم فنکار۔منٹو'' میں یہ زاویۂ فکر بڑے قرینے سے اور جامعیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

نظم کے چوتھے بند میں شاعر نے منٹو کی تحسین اس ماحول کے تناظر میں کی ہے لیکن نظم میں کہیں منٹو کا نام نہیں لیا گیا بلکہ صرف اسمِ ضمیر استعمال کیا گیا ہے۔

اس جفا کی رزم گہ کے سائے میں
اس جہانِ رنج و غم کے درمیاں
ایک فرزانہ بنامِ زندگی
ایک دیوانہ بعنوانِ جہاں

زندگی کے جاودانی ساز پر
عظمتِ آدم کے گن گاتا رہا
اپنے اشکوں سے چمن سینچا کیا
خونِ دل سے نقش چمکاتا رہا

اس کا فن لوح و قلم کی کائنات
اس کا فن ماحول کا عکسِ حسیں![13]

زاہد نبی کی نظم ''بندہ بھائی کا منٹو'' سماجی ماحول میں موجود گھٹن کے خاتمے کا اشارہ اور نوید ہے۔ معاشرتی ڈھانچے کی شکست اور اس کی ساخت میں تبدیلی کی وہ تمنا جو منٹو کے افسانوں میں ہے،

اس نظم میں اُس کا اظہار شعری پیرائے میں ہے۔

نظم میں تین کردار ہیں شاعر، بندہ بھائی اور منٹو۔ بندہ بھائی کا کردار عصری فضا کے جامد اور غیر تخلیقی رویوں جب کہ منٹو اِسی صورتِ حال کے خلاف توانا مزاحمت کی علامت ہے۔ نظم میں بندہ بھائی کی خوفزدگی دراصل جمود سے اُس کی عقیدت کا اظہار ہے۔ شاعر کا کردار بندہ بھائی کو منٹو کی آمد کی نوید سناتے ہوئے مزید خوفزدہ کرتا ہے۔ اُس کا ٹھٹھہ بھی اُڑاتا ہے۔ یہاں منٹو کا کردار محض ایک نجات دہندہ کا نہیں بلکہ ایک کھلی اور کشادہ فضا کے خالق کا ہے۔ وہ فضا، جسے حقیقی معنوں میں زندگی کہا جاتا ہے۔

موضوعی اور فکری سطح پر اس نظم میں ن م راشد کی نظم ''زندگی سے ڈرتے ہو'' کا آہنگ بھی سنائی دیتا ہے۔ خصوصاً نظم کا پہلا نصف حصہ اُسی طنز کی کاٹ رکھتا ہے جو راشد کی نظم میں زندگی سے ڈرنے والوں کے لیے دکھائی دیتی ہے۔ اس پہلو کی طرف اشارے کا یہ مقصد نہیں کہ زاہد نبی کی نظم پر راشد کا اثر ہے یا اُن کے اسلوب کی کوئی چھاپ ہے بلکہ یہ محض فکری اشتراک کا اظہار ہے۔ نظم کے نصف آخر کی تمثال گہری معنویت کی حامل ہے اور مصرعوں میں منٹو کی بعض کہانیوں کی طرف ایمائی اشارے بھی ہیں۔

بندہ بھائی!
تاویلوں کے تالوں کو مصرف میں لاؤ
جتنا چاہو باطن میں اندھیرا بھر لو
خود سے بھاگو
بھاگو جتنا بھاگ سکو ہو
گھومو ...... کاٹھ کے گھوڑے پر تم دنیا گھومو
بندہ بھائی!
ایسا کتنی دیر چلے گا؟
ہر بے حد کی حد ہوتی ہے
دیکھنا اک دن آ جائے گا
پیپر ویٹ کے نیچے رکھے دستاویزی بیانوں سے

باہر کی دنیا کے من میں پیر رکھے گا
بندہ بھائی!
دیکھنا منٹو آجائے گا[۱۴]

منٹو کی تحسین میں لکھی گئی نظموں میں ایک اور قابلِ ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ بعض نظمیں منٹو کے افسانوں کے فکری تناظر میں لکھی گئی ہیں۔ ایسی نظمیں، ان افسانوں کی منظوم تعبیر بھی ہیں اور ان افسانوں کے مرکزی کرداروں کی تحسین بھی۔

منٹو کے افسانے ''ہتک'' کے تناظر میں لکھی گئی چھ نظمیں اس افسانے کے مرکزی کردار سوگندھی کے نام پر ہیں۔ بلراج کومل کی نظم میں سوگندھی اپنا دکھ سناتے ہوئے ماں کو پکارتی ہے۔ ہتک کے بعد وہ بدبودار ماحول سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اندر اُس عورت کو تلاش کرتی ہے جو ماں بھی ہے اور بیٹی بھی۔ نظم میں اُس کا کردار ایک غمزدہ بیٹی کے طور پر اُبھرتا ہے جو ماں کو پکارتی بھی ہے اور اپنے وجود میں بھی اُس ماں کو تلاشتی ہے جسے غلیظ مردوں نے اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنا لیا۔ نظم میں ماں کو پکارنے کا اسلوب یہ بھی ظاہر کرتا ہے جیسے وہ اُسی ماں کو پکار رہی ہے جسے خدا نے تخلیق کی استعداد عطا کی لیکن اُس کا باطن اب اِس صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔

میری کوکھ میں
ایک نودمیدہ پھول تھا
جو خنجروں کی یلغار میں
خاموش تو ہوگیا
لیکن خیالِ موسمِ گل سے
جب سرسبز ہو جاتا ہے
تو سورج کے برابر
ایک انگارہ
میرے وجود کی گہرائیوں میں
سلگ اُٹھتا ہے[۱۵]

منٹو کے افسانے ''ہتک'' کا اختتام اِس بظاہر مکروہ واقعے پر ہوتا ہے کہ:

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اُس کو اپنا دل
پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اُس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور
ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اُسے پہلو میں لٹا کر سوگئی۔[۱۶]

سوگندھی کا کتے کو پہلو میں لٹا کر سلانا منٹو کی افسانوی کائنات کی ظاہری اور سطحی تعبیروں کی روشنی میں کئی ایک مفاہیم رکھتا ہے لیکن بلراج کومل کی یہ نظم اُس عمل کو ایک قطعی پاکیزہ تعبیر عطا کرتی ہے۔ نظم کا اختتام اِس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ سوگندھی کا یہ عمل اپنی کوکھ کو ہرا دیکھنے کی تمنا کا اظہار ہے۔ وہ خارش زدہ کتے کو اُسی طرح گود میں اُٹھاتی ہے جیسے ایک ماں اپنے بچے کو آغوش میں لیتی ہے اور پھر اُسے وہی سکون ملا جو ایک ماں کو مامتا کا جذبہ جگا کر ملتا ہے۔

تیرے جراثیمی لمس کے اعجاز سے
آج تھکی ہاری ماں کی آنکھ لگ گئی
لوری تو مجھے سنانی تھی
تیری نیند پری کو بلانے کے لیے
تیرے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے
آج تو نے ماں کا خالی پن
اُس کی اتھاہ واماندگی
اپنے مضمحل جسم میں کیوں سمیٹ لی
میں جنموں کے سلسلوں سے
گذر گئی
شب گراں کی انتہا تک
سنور گئی[۱۷]

سوگندھی پر تخلیق کی گئی شہریار کی نظم اپنے بعض واضح اشاروں کے باوجود متن کی مجموعی تفہیم کی متنوع نوعیتیں رکھتی ہے۔ اُسلوب کے لحاظ سے اِس میں بعض کردار بھی نظر آتے ہیں۔ یہ وہ افراد بھی ہو سکتے ہیں جو سوگندھی کے گاہک بن کے آتے ہیں۔ خصوصاً مادھو کا کردار جو افسانے کے اختتام پر سوگندھی کی طرف سے قطعی طور پر ایک غیر متوقع رویے کا سامنا کرتا ہے۔

آزاد نظم کی ہیئت میں لکھی گئی یہ مختصر سی نظم اپنے اندر غزل ایسی ایمائیت رکھتی ہے اور لطیف اسلوب کے باعث ابہام کے باوجود اپنے اندر گہری اثر انگیزی کا عنصر رکھتی ہے۔

تری گلی میں ہر طرف سے آ رہے ہیں بھیڑیے
کواڑ کھول، دیکھ کیسا جشن ہے
ہوا مجرا وہ چاند
سات انچ نیچے آ گیا
غذا ملے گی چیونٹیوں کو تیرا کام ہو گیا
ہمارے ناخنوں کے میل سے
ترے بدن کے گھاؤ بھر گئے
یہ حادثہ بھی ہو گیا
مگر کہاں سے بیچ میں یہ آسمان آ گیا [۱۸]

نظم میں آسمان کا استعارہ جسم سے ماورائیت، ماحول کی آلودگی سے گریز اور روحانیت کی طرف رجوع کا مفہوم بھی دیتا ہے اور باطن سے اٹھنے والی کسی آواز کے باعث اس خلل انگیزی کا اظہار بھی ہے جو افسانے کے اختتام پر ہونے والے حادثے کی وجہ سے سوگندھی کے ماحول میں واقع ہوتی ہے۔

''مگر کہاں سے بیچ میں یہ آسمان آ گیا۔'' یہ سوال سوگندھی کے گاہکوں کی جھنجلاہٹ کو بھی ظاہر کرتا ہے۔گلی کے باہر پھینکی جانے والی تصویروں کے کردار اِسی سوال کے ذریعے اپنے اضطراب کو رقم کرتے نظر آتے ہیں۔

کمار پاشی کی نظم میں ایک مونولوگ ہے جس میں تخلیق کار نے سوگندھی کے کردار کی ذہنی کشمکش اور اُس کے باطن میں موجود مبارزت کی تصویر کشی کی ہے۔ اُس کے جسم کی خارج کی فضا اور روح کے داخلی ماحول میں جس تضاد نے جنم لیا ہے وہ اُس کے ضمیر پر ایک تیر نیم کش کی طرح لگا ہے۔

نظم کی پوری فضا میں حروفِ استفہام کی تکرار ہے اور بیشتر مصرعے سوالیہ نشان پر ختم ہوتے ہیں۔ بظاہر یہ سوال سوگندھی اپنے آپ سے کر رہی ہے لیکن نوعیت کے لحاظ سے یہ تمام تر گہرے

استفسارات پورے معاشرے سے متعلق ہیں۔ اُس کی ذہنی کشمکش پورے ماحول کے تضادات کی عکاسی کرتی ہے اور کردار کی حیرت یا ندامت اُس کی ذات سے نکل کر پوری سوسائٹی اور اُس کے نظامِ خیال کو ایک گہرے طنز کے دائرے میں اسیر کرتے ہیں۔

نظم کا اختتام فرار اور گریز کے احساسات پر ہوا ہے۔ ایک ایسا فرار جس کے بعد کوئی دوسرا تو کجا خود اُسے بھی اپنا پتا نہ ملے۔

اب گہرے سناٹے میں کس کو آواز لگاؤں
کون آئے گا مدد کو میری
کیا چیخوں، چلاؤں
اپنے گوشت کی میلی چادر
اوڑھ کے چپ سو جاؤں
اور اچانک نیندوں کی دلدل میں گم ہو جاؤں
کسی کے ہاتھ نہ آؤں
خود کو خود میں ڈھونڈنے نکلوں
لیکن کہیں نہ پاؤں[19]

سرمد صہبائی کی نظم سیدھے سبھاؤ میں لکھی گئی ہے۔ نظم کا متن سوگندھی کے کردار اور طرزِ حیات ہی کی عکاسی کرتا ہے لیکن نظم منٹو کے افسانے کے مزاج اور پلاٹ سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتی بلکہ ہر اُس عورت کے دکھ کی عکاسی کرتی ہے جو کسی بھی مجبوری کی بنا پر جسم فروشی کے پیشے کو اختیار کرتی ہے۔ اِس نظم کے حوالے سے یہ بھی امر قابل ذکر ہے کہ سرمد صہبائی کے مجموعۂ نظم پل بھر کا بہشت میں یہ نظم ''سوگندھی'' کے عنوان کے بجائے ''وہ گھر بسانے کی خواہش میں'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور متن میں بھی قدرے ترمیم کر دی گئی۔[20]

محمد علوی کی نظم ''خارش زدہ کتے'' کے عنوان سے ہے اور افسانے کے متن سے اس کی مطابقت بھی عنوان ہی کی حد تک ہے۔ نظم میں جس کتے کا کردار پیش کیا گیا، اس کا منٹو کی کہانی سے فکری یا موضوعاتی ربط بمشکل ہی دکھائی دیتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نظم کے خالق نے افسانے کی تعبیر ہی

قدرے پیچیدہ پیرائے میں کی ہو۔

گلزار کی نظم کی فکری بنیاد منٹو کے افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" پر ہے اور بشن سنگھ کے کردار کے تناظر میں تقسیمِ ہند پر تخلیق کار کے دکھ کو اجاگر کرتی ہے۔ شاعر اس کردار سے مل کر اس کے ساتھ اپنا یہ دکھ بانٹنا چاہتا ہے نیز اس کے اس انتظار کو ختم کرنا چاہتا ہے جو وہ اپنے گمشدہ رشتوں کی واپسی کے باعث مستقل کھڑے ہو کر کھینچ رہا ہے۔

گلزار اس نظم میں بشن سنگھ کی پکار ان لایعنی کلمات کی صورت میں سنتا ہے جو افسانے میں وہ ادا کرتا رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی پکار کا جواب دے اور اسے ان تلخ حقائق سے باخبر کرے جو بٹوارہ ہونے اور بٹوارے کے بعد فسادات کی صورت میں سامنے آئے۔ نظم میں افسانے کے متن میں موجود فکری گرہ کھولنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ لیکن اسلوب کے لحاظ سے بہت سے مصرعے ایک نشریاتی بیانیہ (broadcasting narration) محسوس ہوتے ہیں جن میں شعریت کا عنصر کم اور منقول نظموں والی لذت کا عنصر زیادہ ہے۔

مجھے واگہہ پہ ٹوبہ ٹیک سنگھ والے بشن سے جا کے
ملنا ہے
خبر دینی ہے اس کے دوست افضل کو
وہ لہنا سنگھ، ودھاوا سنگھ وہ بھین امرت
جو سارے قتل ہو کر اس طرف آئے تھے
ان کی گردنیں سامان میں ہی
لٹ گئیں پیچھے
ذبح کر دے وہ "بھوری" اب کوئی لینے نہ آئے گا!

وہ لڑکی ایک انگلی جو بڑی ہوتی تھی ہر بارہ مہینوں میں
وہ اب ہر اک برس اک پوا پوا گھٹتی رہتی ہے
بتانا ہے کہ سب پاگل ابھی پہنچے نہیں اپنے ٹھکانوں پر
بہت سے اِس طرف ہیں اور بہت سے اُس طرف بھی ہیں
مجھے واگہہ پہ ٹوبہ ٹیک سنگھ والا بشن اکثر یہی کہہ کے بلاتا ہے

"اوپڑ دی گڑ گڑ دی منگ دی وال دی لالٹین دی ہندوستان تے پاکستان"[۲۱]

منٹو کی منظوم تحسین میں راجہ مہدی علی خاں کی اس نظم کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو منٹو کی طرف سے جنت سے لکھے گئے ایک خط کی صورت میں ہے۔مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی یہ طویل نظم چھے بندوں میں تقسیم کی گئی ہے اور منٹو پر لکھی گئی دیگر منظومات میں جو موضوعات ایک فکری گھمبیرتا کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں، اس نظم میں انھیں قدرے شگفتہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔

منٹو کی طرف سے اس خط میں راجہ مہدی علی خاں کو دنیا چھوڑ کر جنت میں آبسنے کا مشورہ دیا گیا ہے، نیز ان اہلِ قلم کو بھی ساتھ لانے کی فرمائش کی گئی ہے جو تا حال عدم آباد کی طرف نہیں آئے۔نظم میں طنز کا رویہ نمایاں ہے خصوصاً دانشوروں اور ادیبوں کے ساتھ اہلِ زمانہ کے سلوک پر منٹو کی طرف سے گریہ زاری بھی کی گئی ہے۔نظم میں جہاں جہاں طنزیہ اشعار آئے ہیں وہاں شگفتگی کے بجائے سنجیدگی در آئی ہے لیکن جہاں جنت میں حوروں کا ذکر ہے وہاں ایک ملا کا کردار تراش کے مزاح کی چاشنی پیدا کی گئی ہے۔نظم کے آخری بند میں اس دعا کے ساتھ عصمت چغتائی، فیض اور راشد کا بطورِ خاص ذکر ہے کہ:

دعا ہے یہ خدایا سب زمیں کے دوست مر جائیں
یہ جنت کے چمن، یہ گھر، یہ سڑکیں اُن سے بھر جائیں[۲۲]

منٹو کی تحسین جہاں نظم کے پیرائے میں ہوئی ہے، وہاں صنفِ غزل میں بھی ان کی یاد کو ایک مختلف قرینے سے محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔غزل کا پیرایہ نظم سے محض ہیئت کی سطح پر مختلف نہیں بلکہ یہ ایک خاص مزاج اور اسلوب کا نام ہے۔غزل کے شاعر کو نظم کی طرح بہت سی آزادیاں حاصل نہیں ہوتیں اور کئی ایک حد بندیاں اس کے آڑے آتی ہیں۔اظہار کا وہ واضح پیرایہ جو نظم میں اختیار کیا جا سکتا ہے یا بہت سے الفاظ، جو نظم کے فریم میں کھپائے جائیں تو وہ اجنبی نہیں لگتے، غزل کے دائرے میں ان کا استعمال کئی ایک مشکلات پیدا کرتا ہے۔اگرچہ اس مشکل کا شعور بعض شعرا کے ہاں نہیں دکھائی دیتا اور وہ غزل کے محض فریم کی سہولت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

منٹو کی یاد میں کہی گئی حفیظ ہوشیارپوری کی غزل میں منٹو کی شخصیت کا خاکہ بھی ہے، منٹو کے

ماحول کی بدصورتیاں بھی ہیں، منٹو کی بادہ نوشی کا بھی ذکر ہے اور اس کی افسانہ نگاری کی تخلیقی جہتوں کا عکس بھی۔ لیکن یہ سب کچھ اس پیرائے میں نہیں جو نظم نگاروں نے اختیار کیا بلکہ غزل کے مخصوص تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاعر نے ایمائی اسلوب میں بیان کیا ہے:

اک زندگی تھی جس کو غمِ جسم و جاں کہیں
اک زندگی ہے رابطۂ جسم و جاں سے دور
مے تلخ ہی سہی، مئے ہستی ہے تلخ تر
کچھ تلخیاں ہیں تلخیٔ کام و دہاں سے دور
اب اُس کے ذکر سے بھی ہیں نادم کہ یہ حفیظؔ
افسانے سے قریب ہے، افسانہ خواں سے دور[۲۳]

منٹو کی تحسین کے لیے رقم کیا گیا مذکورہ سرمایہ شعرا کی وہ کاوشیں ہیں، جو ناخن کا قرض تھیں لیکن یہ نظمیں، غزلیں محض منٹو کی محبت یا اس کی یاد میں رقم نہیں کی گئیں بلکہ اس ماحول کا مرثیہ ہیں جو منٹو کے مرنے کے بعد بھی زندہ ہے۔ یہ نظمیں منٹو کا مرثیہ تو ہیں ہی لیکن یہ ایک فکری شہر آشوب بھی ہیں جو مختلف شعرا نے اپنے اپنے مزاج، افتادِ طبع اور حدودِ ذہنی کے اندر رہتے ہوئے تخلیق کیا۔ ان نظموں کا مجموعی مزاج طنزیہ ہے جس کا خمیر بنیادی طور پر منٹو کے افسانوں سے اٹھا ہے۔ منٹو نے ماحول کی جبریت اور انسان کی فکری، روحانی اور نفسیاتی آزادی کے لیے مسلسل لکھا۔ تہذیب کے کھلے پن اور جھوٹی اخلاقیات کی حقیقت عیاں کرنے کے لیے ایک بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا اور اس کے صلے میں نہ صرف مقدمات کو بھگتا بلکہ دیگر کئی ایک حوالوں سے علامتوں کا بھی سامنا کیا لیکن اس تمام تر اذیت کے باوجود مسلسل لکھا اور کہانیوں میں ایسے کردار تراشے، جن کا اردو فکشن میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

منٹو پر لکھی گئی یہ نظمیں ایسے شخصی خاکے ہیں جن میں موضوع کے خدوخال کے اندر اس کے ماحول کی بھی پوری تصویر نظر آتی ہے۔ ان نظموں کو مجموعی طور پر دیکھیں تو یہ قدر مشترک نظر آتی ہے کہ شعرا نے نظامِ حیات اور اقدارِ زندگی کو کم و بیش ویسے ہی طنز کا ہدف بنایا ہے جو منٹو کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے اور ان نظموں میں اُسی غصے کا تسلسل دکھائی دیتا ہے جو ان کی کہانیوں کے خمیر میں پایا جاتا ہے۔

مذکورہ نظموں کے علاوہ حمایت علی شاعر کی نظم ''شہید ساز''، خاطر غزنوی کی نظم ''منٹو'' اور بجنوری کی نظم ''مرگِ آذر'' قمر لدھیانوی کی نظم ''اے ارضِ پاک''، حسن حمیدی کی نظم ''جہل اور فن کار''، تزئین راز زیدی کی نظم ''منٹو'' غالب عرفان کی نظم ''حقیقت نگار منٹو''، شگفتہ بریلوی کا مقطع بعنوان ''منٹو'' اور قتیل شفائی کی غزل بھی اسی تحسین کا تسلسل ہیں۔

حوالہ جات و حواشی

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، جی سی یونی ورسٹی، فیصل آباد۔

۱۔ محمد طفیل، ''اداریہ''، نقوش لاہور، منٹو نمبر، شمارہ ۵۰–۴۹ (سن ندارد)؛ ص ۲۔

۲۔ سعادت حسن منٹو، ''منٹو بنام مجید امجد''، قند پشاور، مجید امجد نمبر، جلد ۳، شمارہ ۹–۸ (جون ۱۹۷۵ء)؛ ص ۲۲۱۔

۳۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۳۲۔

۴۔ سجاد شیخ، ''نظم 'منٹو' کا تجزیاتی مطالعہ''، مشمولہ دستاویز مجید امجد نمبر، شمارہ ۵ (اپریل تا جون ۱۹۹۱ء)؛ ص ۸۳۔

۵۔ یونس جاوید، حلقہ اربابِ ذوق (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۸۲۔

۶۔ شاد امرتسری، ''سعادت حسن منٹو''، مشمولہ سعادت حسن اور منٹو از ابدال احمد جعفری (لاہور: نگارشات، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۱۸۔

۷۔ ظفر اقبال، ''سعادت حسن منٹو''، مشمولہ راوی لاہور، جلد ۴۹ (جنوری ۱۹۵۵ء)؛ ص ۲۹۔

۸۔ ظفر اقبال، ''خراج''، زیست کراچی، منٹو صدی نمبر (۲۰۱۲ء)؛ ص ۲۹۵۔

۹۔ مصطفیٰ زیدی، ''ایک علامت''، کلیاتِ مصطفیٰ زیدی (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۵۱۲۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۷۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۸۔

۱۲۔ حبیب جالب کی یہ نظم ان کے کلیات میں شامل نہیں۔ نزہت جبین کی تحقیق کے مطابق:

> یہ نظم حبیب جالب کے شعری انتخاب جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے، جس کا انتخاب سعید پرویز صاحب نے کیا ہے، کے دوسرے ایڈیشن، سال اشاعت مئی ۲۰۰۶ء میں معروف ادیب، ڈراما نگار حمید کاشمیری کی ہینڈ رائٹنگ میں شائع ہوئی ہے۔ نظم کے نیچے سعید پرویز نے لکھا ہے: یہ نظم حمید کاشمیری مرحوم نے اپنے ہاتھ سے مجھے لکھ کر دی تھی۔ انھیں یہ نظم زبانی یاد تھی۔

نزہت جبین، حبیب جالب کی غیر سیاسی شاعری، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء–۲۰۱۵ء، ص ۹۶۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نظم کا پورا متن درج کیا جائے:

سر پہ چھائی ہوئی جہل کی رات ہے
اور یہ اپنے بزرگوں کی سوغات ہے
اپنا علمی ادارے سے کیا واسطہ
ہم کو منٹو بے چارے سے کیا واسطہ
کس نے اس سے کہا تھا فسانے لکھے
یوں ہمارے لیے خاک چھانے، لکھے
کیوں نہ کی نوکری اس نے سرکار کی
ایک کج فہم جاہل زمیں دار کی
مدح کرتا اگر وہ چچا سام کی
زندگی اس کی ہوتی بڑے کام کی
مرگیا ہے جو منٹو تو ہم کیا کریں
اک ذرا بات پہ آنکھ نم کیا کریں

۱۳۔ احمد ریاض، موج جنوں (لاہور: الجدید، سن ندارد)، ص۲۲۔

۱۴۔ زاہد نبی، https://www.facebook.com/photo.php?fbid=10155952809595394&set=a.10150777754450394.731824.852600393&type=3&theater

۱۵۔ بلراج کومل، "سوگندھی" شعور دہلی، منٹو نمبر (اپریل ۱۹۸۰ء): ص۲۴۔

۱۶۔ سعادت حسن منٹو، منٹو کے افسانے (دہلی: ساقی بک ڈپو ۱۹۴۰ء)، ص۸۷۔

۱۷۔ بلراج کومل، ص۲۵۔

۱۸۔ شہریار، "سوگندھی" شعور دہلی، منٹو نمبر (اپریل ۱۹۸۰ء): ص۲۶۔

۱۹۔ کمار پاشی، "سوگندھی" شعور دہلی، منٹو نمبر (اپریل ۱۹۸۰ء): ص۲۹۔

۲۰۔ منٹو پر سرمد صہبائی کی نظم کے متن کا اختلاف ذیل میں ملاحظہ ہو:

"سوگندھی"

وہ گھر بسانے کی خواہش میں
اپنے بدن کی معصیت میں نکلی
گھروں کی طرف لوٹتے راستوں پر
ہواؤں میں سازش کا موسم تھا
انجان چہروں کے جنگل میں
پیڑوں پہ سانپوں کے پھن لہلہاتے تھے
لیکن وہ اپنی جوانی کے پتے میں بھٹکی

بڑی دیر تک زرد پتے کی صورت
دلاسوں کے شانوں پہ اُڑتی رہی
نیم تاریک گلیوں میں سانس کی لَو
ٹمٹماتی رہی

اس کی آنکھوں میں سب خواب پتھرا گئے
اس کے سینے پہ مہتاب گہنا گئے
اب وہ خواہش کے آسیب کو تھام کر
رات دن کے پُلوں سے گذرتی ہے
اُجڑے گھروں کے مسافر کو
اپنی کہانی سناتی ہے
اور صبح ہونے سے پہلے
اسے بھول جاتی ہے

سرمد صہبائی، "سوگندھی" شعور دہلی، ص ۹۷۔

"وہ گھر بسانے کی خواہش میں"

وہ گھر بسانے کی خواہش میں
اپنے بدن کی معیت میں نکلی
ہواؤں میں سازش کا موسم تھا
لیکن وہ اپنی جوانی کے پتے میں بھٹکی
بڑی دیر تک زرد پتے کی مانند
جھوٹے دلاسوں کی شاخوں پہ اُڑتی رہی

اس کی آنکھوں کے روشن ستارے
بیابان رستوں میں پتھرا گئے
اس کے سینے پہ مہتاب گہنا گئے

اب وہ خوابوں کے آسیب کو تھام کر
رات دن کے پُلوں سے گذرتی ہے
تنہا بدن کی سرائے میں ٹھہرے مسافر کو
اپنی کہانی سناتی ہے
اور صبح ہونے سے پہلے
اسے بھول جاتی ہے

سرمد صہبائی، "وہ گھر بسانے کی خواہش میں" پل بھر کا بہشت (لاہور: دستاویز، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۵۔

۲۱۔ گلزار "سعادت حسن منٹو"، مشمولہ سعادت حسن اور منٹو، ص ۴۲۹۔

۲۲۔ راجہ مہدی علی خاں، ایضاً، ص۲۲۳۔

۲۳۔ حفیظ ہوشیار پوری، ایضاً، ص۲۳۲۔

مآخذ

اقبال ظفر۔ "خراج"۔ زیست کراچی، منٹو صدی نمبر (۲۰۱۲ء): ص۴۹۵۔

_____۔ "سعادت حسن منٹو"۔ مشمولہ راوی لاہور جلد ۴۹ (جنوری ۱۹۵۵ء) ص ۴۹۔

امجد، مجید۔ کلیاتِ مجید امجد۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔

پاشی، کمار۔ "سوگندھی"۔ شعور دہلی، منٹو نمبر (اپریل ۱۹۸۰ء): ص ۷۹۔

جاوید، یونس۔ حلقہ اربابِ ذوق۔ لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۱۲ء۔

جبیں، نزہت۔ حبیب جالب کی غیر سیاسی شاعری۔ غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء۔ ۲۰۱۵ء۔

جعفری، ابدال احمد۔ سعادت حسن اور منٹو۔ لاہور: نگارشات، ۲۰۱۳ء۔

ریاض، احمد۔ موج جنوں۔ لاہور: انجدیہ، سن ندارد۔

زیدی، مصطفیٰ۔ "ایک علامت"۔ کلیاتِ مصطفیٰ زیدی۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔

شہریار۔ "سوگندھی"۔ شعور دہلی، منٹو نمبر (اپریل ۱۹۸۰ء) ص ۲۶۔

شیخ، سجاد۔ "نظم 'منٹو' کا تجزیاتی مطالعہ"۔ مشمولہ دستاویز مجید امجد نمبر، شمارہ ۵ (اپریل تا جون ۱۹۹۱ء) ص ۸۳۔

صہبائی، سرمد۔ پل بھر کا بہشت۔ لاہور: دستاویز، ۲۰۱۲ء۔

طفیل، محمد۔ "اداریہ"۔ نقوش لاہور، منٹو نمبر، شمارہ ۵۰-۴۹ (سن ندارد): ص ۲۔

کومل، بلراج۔ "سوگندھی"۔ شعور دہلی، منٹو نمبر (اپریل ۱۹۸۰ء) ص ۲۴۔

منٹو، سعادت حسن۔ "منٹو بنام مجید امجد"۔ قند پشاور، مجید امجد نمبر، جلد ۳، شمارہ ۹-۸ (جون ۱۹۷۵ء): ص ۲۲۱۔

نبی، زاہد۔ https://www.facebook.com/photo.php?fbid=10155952809595394&set=a.10150777754450394.731824.852600393&type=3&theater